پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین
پرنسپل گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج
کوٹ سلطان
-
پروفیسر ڈاکٹر راشدہ قاضی
پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس،
ڈی.جی خان۔

'جو ہم پہ گزری' اردو کی ایک اہم غیر مطبوعہ خودنوشت (تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

UNPUBLISHED AUTOBIOGRAPHY 'JO HUM PAY GUZRI' A RESEACH AND CRITICAL ANAYLISIS

Abstract

Auto-biography happens to be one of the most important genres of literature. Urdu literature is replete with quite a rich storage of Auto-biographies. Auto-biography, not only, describes the life events of a writer; but it also encompasses the entire history of his age. Writing about one's .Own self is believed to be the hardest of crafts. Auto-biography is a blend of creative literature as well as other literature i.e. Political/ economic/ geographic history .

"Jo Ham Pe Guzri" 'is an auto-biography of a versatile intellectual writer Dr. Mahr AbdulHaq which is yet to be published. This auto-biography not only encompasses his personal life. events, but the political, literary and cultural conduct of people in the back drop of twentieth century. The present thesis comprises of a research based critical study of this important document.

ڈاکٹر مہر عبدالحق (1915ء-1995ء) بیک وقت ماہر لسانیات، ماہر فریدیات، شاعر، محقق، مترجم، مفسر، مورخ، ناول نگار اور ماہر لغت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ 1957ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بعنوان ''ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق'' لکھ کر اردو زبان کے مباحث میں ایک نئی بحث کا آغاز کیا کہ اردو زبان نے ملتانی زبان سے جنم لیا ہے اور اس بحث کے لیے عملی تحقیق کر کے اردو کے بہت سے ان ابتدائی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کا تعلق ملتانی زبان سے ہے۔ یہ وہی الفاظ ہین جن کا ذکر محمود شیرانی نے پنجابی زبان کی ذیل میں کیا تھا اور بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق میں انہی الفاظ کا حوالہ دیا ہے۔ مہر عبدالحق نے اپنی تصنیفی زندگی میں کئی معتبر کتب لکھیں جن میں سے اکثر ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئی تھیں مگر ابھی تک کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں جو تشنہ ءِ طباعت ہیں۔ ان کتب میں ان کی خود نوشت سوانح عمری بہ عنوان ''جو ہم پہ گزری'' بھی ہے۔ اگر اس خود نوشت کو انور طباعت سے آراستہ کر دیا جائے تو اس خود نوشت کا شمار اردو کی بہترین سوانح عمریوں میں ہو گا۔ یہ سوانح عمری تاریخ، تہذیب، ثقافت اور علم و ادب کے پس منظر میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل کہ ہم زیرِ نظر سوانح عمری کا ناقدانہ اور محققانہ مطالعہ پیش کریں، یہ ضروری دکھائی دیتا ہے کہ ہم ''خود نوشت سوانح عمری'' کی ان تعریفوں کا جائزہ لیں جو مختلف ماہرینِ فن نے بیان کی ہیں۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''انگریزی Autobiography کے مترادف کے طور پر آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، وہ کتاب جو اپنے ذاتی احوال و کوائف کے بارے میں تحریر کی گئی ہو، اس لحاظ سے پنجابی لفظ 'ہڈ بیتی' بھی بہت مناسب ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر سلیم اختر اس تعریف کے بعد خود نوشت کی توضیح دلچسپ انداز میں اس طرح سے کرتے ہیں:

> ''اپ بیتی کی تحریر کا نفسی محرک نرگسیت Nurcisism ہے۔ لکھنے والا آپ بیتی کو ایسے آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے جس سے وہ دنیا والوں کے سامنے اپنا رویہ پیش کرتا ہے جس سے وہ دوسروں کے مقابلے میں ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مثبت اور منفی دونوں طرح کا انداز اور اسلوب اپنایا جا سکتا ہے۔ اپنے بارے میں غلو سے بھی کام لیا جا سکتا ہے (مثال: جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'') اور سادہ بیانی سے بھی (مثال: میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'') اپنے خراب حالات چھپائے نہیں جاتے (مثال: احسان دانش کی ''جہانِ دانش'') اور اپنی ذات کے حوالہ سے تہذیب و ثقافت کی بھی بات کی جاتی ہے

(مثال: قراۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'') اپنا دفاع پیش کیا جاتا ہے (مثال: قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'') اور خود ہی اپنا محاسبہ کیا جاتا ہے (مثال: ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک'') الغرض آپ بیتی میں اظہار و اسلوب کا بہت تنوع ملتا ہے۔''(۲)

اسی طرح خود نوشت کے بارے میں چند اور ماہرین کی آرا دیکھیے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر:

''آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتمادی کا خط بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔ دنیا کے عام ذخیرہ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد و نظر سے باہر نہیں۔ ہمارے لیے غور و فکر اور چھان بین کے ذریعے سے یہ ہمہ وجود صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں لیکن نفسِ معلوماتِ صحیحہ کے نقطہء نظر سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دور کے ذخیرہءتاریخی اور انبارِ عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامل کیوں کیا جائے۔''(۳)

بقول مشفق خواجہ:

''خود نوشت کا اصل مقصد انکشافِ ذات ہے لیکن سماجی قیود اور اخلاقی مفروضات اسے [پردہءذات' بنا دیتے ہیں اور اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود نوشت سوانح عمری لکھ دی جائے۔'' (۴)

الطاف فاطمہ ''خود نوشت'' کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں:

''ایک اچھا 'آپ بیتی' لکھنے والا جانتا ہے کہ جو اعمال اور افعال خود اس سے سرزد ہو چکے ہیں، ان کا تعلق اس کی ذات سے صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے نام اور ذات سے ہی منسوب ہیں اور اب وہ دوسروں کی امانت ہیں کیونکہ دوسروں کو ان سے سبق لینا ہوتا ہے۔'' (۵)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''خود نوشت'' آپ بیتی کے حوالے سے ایک منفرد پہلو سے اس طرح رقم طراز ہیں:

''آپ بیتی عام طور پر قابلِ اعتماد سوانح نہیں ہوتی اور مکمل، معیاری اور بے لاگ آپ بیتی لکھنا ممکن بھی نہیں کیونکہ حبِ ذات صداقت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا حبِ ذات سے مجبور ہو کر کہیں اخفا، کہیں مبالغہ اور کہیں ملمع سازی کا مرتکب ہوتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں انسان اپنے آپ سے بھی چھپاتا ہے۔ دوسروں کو ان رازوں میں کیا شریک کرے گا۔ چنانچہ آپ بیتی میں سب کچھ کہہ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ معاشرتی حیوان ہے۔ اس لیے وہ اپنی ذات کو بے نقاب کرتے ہوئے تحسین، ملامت اور دوسروں کے رد عمل سے یکسر بے نیاز بھی نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کے بارے میں سچ بولنا نسبتاً آسان ہے مگر

اپنے بارے میں لکھتے ہوئے کھر دری صداقت کو ملحوظ رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ 'آپ بیتی' لکھنے والا بسا اوقات اپنے عیوب کو چھپاتا ہے یا ان کی تاویل کرتا ہے۔ خود مجرم کو اپنا منصف بننے کا موقع دیا جائے تو وہ اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے اور اپنے تئیں حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے اور ممکن ہو تو واقعے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔" (٦)

ان آرا کی روشنی میں جب ہم ڈاکٹر مہر عبدالحق کی خود نوشت "جو ہم پہ گزری" کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اس صنف کو خوب سمجھا اور اس کی صحیح روح کو مد نظر رکھ کر اپنی سوانح کے احوال قلم بند کیے۔ ایک بات توجہ طلب ہے کہ 'خود نوشت' کے حوالے سے لکھنے والے کسی بھی ماہر نے اس پہلو کو نہیں چھیڑا کہ "خود نوشت" کیسے لکھنی چاہیے؟ اور کس کی خود نوشت اہم ہو گی؟ یہ بات تو سچ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی سوانح عمری یا آپ بیتی لکھ سکتا ہے مگر راقم کے خیال میں خود نوشت ہمیشہ اسی شخص کی اہم ہوتی ہے جو سماجی، سیاسی یا ادبی اور علمی حوالے سے اہم ہو کیونکہ قاری کے سامنے دلچسپی کا عنصر اسی وقت قائم رہے گا جب خود نوشت نگار، معروف اور اہم ہو گا۔ نہیں تو یہ تحریر مصنف کی فیملی کے دائرے تک ہی محدود رہے گی۔ اس تناظر میں زیر نظر خود نوشت کئی اعتبار سے اہم ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ اس تصنیف کو لکھے تین دہائیاں ہونے کو ہیں مگر ابھی تک یہ منصہ ءِ شہود پر نہیں آ سکی۔ اسلوب اور مواد کے اعتبار سے اس خود نوشت کا معیار اردو کی دیگر مطبوعہ خود نوشتوں سے کسی بھی طور پر کم نہیں ہے۔

اس خود نوشت میں مصنف نے داخلی کیفیتوں، دلی احساس، عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اپنے نقطہ ءِ نظر کی خوب ترجمانی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خود نوشت کی تین اہم صورتیں سفر نامہ، رپورتاژ اور روزنامچہ ہوتی ہیں۔ فاضل مصنف نے ان تینوں صورتوں کو بروئے کار لا کر اسے تصنیف کیا ہے اور اسے چودہ ابواب میں ان عنوانات میں منقسم ہے۔

١۔ خاندانی پس منظر۔ ٢۔ اباجی اور امی جان۔ ٣۔ پانچویں جماعت تک کی تعلیم۔ ٤۔ ہائی سکول کے پہلے تین سال۔ ٥۔ نویں اور دسویں کی تعلیم۔ ٦۔ کالج۔ ٧۔ سوز و ساز کے آٹھ سال۔ ٨۔ سحر ہونے تک (١٨٤٣ء۔ ١٩٤٧ء)۔ ٩۔ سحر گرد گرد۔ ١٠۔ سرائیکی ثقافت کے مرکز میں۔ ١١۔ لسانی تحقیق کی تکمیل تک۔ ١٢۔ لاہور، ثقافتِ راوی کا مرکز۔ ١٣۔ نوکری کے آخری دس سال۔ ١٤۔ علمی، ادبی اور تحقیقی کام کی تفصیل۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق زود نویس لکھاری تھے۔ زیرِ تحقیق و تدوین کتب (جو کہ تقریباً چار تھیں، مگر وہ انہیں مکمل نہ کر سکے) کے علاوہ انھوں نے ٣٤ کتب تصنیف کیں۔ ان کتب میں نصاب کے ساتھ ساتھ کہانیاں، ناول، تحقیق اور تنقید، سوانح عمری، فریدیات، لسانیات، تراجم، تفسیر، قواعدِ زبان، فلسفہ، تعلیم،

لغت اور شاعری شامل ہے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا بجا ہے کہ مہر عبدالحق ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے جن کا خمیر مراکز سے بہت دور لیہ جیسے دور افتادہ شہر سے اُٹھا اور انہوں نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے شعر و ادب اور تحقیق و تنقید (اردو و ملتانی زبانیں) کو متاثر کیا۔ اردو زبان کے نام کے بارے میں ایک منفرد رائے دے کر اردو ماہرینِ لسانیات کے لیے نئے سوال پیدا کر دیے۔ ان کا خیال تھا کہ ''اردو'' کا لفظ بنیادی طور پر سرائیکی کا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے استاد سید محمد شاہ بخاری کی اس رائے سے ہمیشہ متفق رہے:

> ''نویں اور دسویں میں اردو کی جو درسی کتاب پڑھائی جاتی تھی، اس کا نام ''مرقع ادب'' تھا۔ اس میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' کا وہ باب بھی شامل تھا جس میں اردو کے معانی ''لشکر'' کے بتائے گئے ہیں اور ''برج بھاشا'' کے علاقے کو اردو کا مولد ٹھہرایا گیا ہے۔ استادِ محترم قبلہ شاہ صاحب کا موقف اس سے مختلف اور زیادہ صحیح تھا۔ انھوں نے فرمایا: ''اڑدو۔۔۔ڑ کی آواز کے ساتھ خالص سرائیکی لفظ ہے۔ ترکی زبان میں یہ لفظ ترک سپاہیوں کی معرفت ''سرائیکی'' سے منتقل ہوا۔ ترکی زبان میں ''ڑ'' کی آواز نہیں ہے۔ اس لیے وہاں یہ لفظ ''اردو'' ہو گیا۔ سرائیکی زبان میں یہ لفظ ''انبوہ، کثرت، زیادتی، انبار، ڈھیری'' وغیرہ کے معنوں میں بولا جاتا ہے اور ابھی تک متروک نہیں ہوا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ آج دکانوں پر خربوزوں کے ''اڑد'' لگے ہوئے تھے۔ اس طرح کالی گھٹاؤں کے ہجوم دیکھ کر کہتے ہیں کہ بادلوں کے ''اڑد'' امڈے آ رہے ہیں۔ سودا سلف لینے جائیں تو دکان دار سے کہتے ہیں کہ ذرا ''اڑد'' تولنا۔ ترازو کے جھکاؤ کو ''اڑاند'' کہتے ہیں۔ یہ مشتقات کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ لہٰذا ''اڑدو'' سرائیکی لفظ ہے اور یہی اس کا صحیح تلفظ ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی آمد اور اس کے نتیجے میں عربی اور فارسی کے اختلاط سے جو نئی زبان وجود میں آئی، اسے وادی سندھ کے مرکز ملتان نے ''اڑدو'' کا نام دیا کیونکہ وادی سندھ ہی وہ سرزمین ہے جس میں یہ لسانی اختلاط پہلی بار ہوا۔'' (۷)

اس بات کا حوالہ انھوں نے اپنی ''خود نوشت'' کے باب پنجم میں بھی دیا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے ''نویں اور دسویں کی تعلیم''۔ یہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ آپ کو سکول کی زندگی ہی سے ایسے اساتذہ مل گئے تھے جنھوں نے آپ کے ادبی ذوق کو ایک نکھار بخشا اور آپ کو آغاز سے ہی بالخصوص سرائیکی زبان و ادب سے وابستہ کر دیا۔ آپ کی خود نوشت کے پہلے باب سے لے کر آخر تک یہ وابستگی بآسانی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس خود نوشت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں جہاں مہر صاحب نے اپنے خاندان اور اپنے احوال پیش کیے ہیں وہاں پس منظر کے طور پر تاریخ سے بھی مکمل استفادہ کرتے ہوئے مستند حوالے دیے

ہیں۔ پہلے باب بعنوان ” خاندانی پس منظر“ میں سمرا خاندان کی وضاحت کرتے ہوئے ”سمیرین“ تہذیب پراس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”راقم الحروف کی کتاب The Soomras میں یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ قبائل کی نقل و حرکت کے اس قدیم زمانے میں میسوپوٹیمیا جنوبی ایران اور موجودہ سندھ اور بلوچستان؛اس طرح الگ الگ علاقے نہیں تھے۔ جس طرح آج کی ملکی تقسیمیں انہیں ظاہر کرتی ہیں۔ نہ ان کے درمیان کوئی سرحدیں تھیں اور نہ لوگوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندیاں عائد تھیں۔ وسطِ ایشیا سے نکل کر ادھر ادھر گھومنے پھرنے والے قبائل میں سے بعض نے کہیں کہیں مستقل آبادیاں قائم کرلی تھیں اور بعض ابھی مستقر کی تلاش میں تھے۔ تاہم یہ سب ایک ہی اصل اور نسل کے شعوب تھے۔ غیر سامی النسل ہونے کی وجہ سے ”سمیر“ کہلاتے تھے۔ سندھ، عراق، بلوچستان اور جنوبی ایران کی تہذیب کو مورخین نے ”سمیرین تہذیب“ کا نام دیا ہے۔ اس تہذیب کے بانی مبانی ”سمرا“ تھے جو آج سندھ میں سومرو، عراق میں سمرا، وسطی وادی میں سمر، سمراہ وغیرہ کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور زندہ و پائندہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔“ (۸)

”دی سومروز“ کو شائع ہوئے چھبیس برس گزر گئے ہیں مگر آج تک مہر صاحب کی اس بات کی تردید نہیں کی گئی کہ سمرا خاندان کا تعلق ”سمیرین تہذیب“ سے تھا۔ اس باب میں انہوں نے آریاؤں کے مقابلے میں سمراؤں کو مہذب اور تمدنی زندگی کے علمبردار کہا ہے جبکہ عام خیال یہ ہے کہ آریا مہذب اور متمدن تھے اور یہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

”وادی سندھ میں سمراؤں کی آمد اور شمالی پہاڑی علاقوں میں کوہ ہندو کش کے قریب آریاؤں کی آمد کے درمیان ایک ہزار سال کا وقفہ ہے۔ سمرا شہری تہذیب کو عروج تک لے جاچکے تھے لیکن آریہ ابھی تک نیم مہذب تھے۔ تہذیبی مراکز کو تہس نہس کردینا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔ سائنتھیا کے حوالے سے سائیتھ کا لفظ عراق عرب وغیرہ میں پہنچا تو یہ اسے ساکا بنادیا۔ چونکہ سمرا کاشتکاری کے بھی ماہر تھے، اس لیے ”جٹ“ کہلائے۔ ان کی ایک شاخ ”مور“ جہاز ران تھی جو آبی شاہراہوں کے ذریعے تجارت کرتی تھی۔“(۹)

اس بات میں ڈاکٹر مہر عبدالحق نے بعض مستند کتب کے حوالے دے کر ”سمراؤں“ کے خاندانی پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ ان کتب میں ”راج ترنگنی“ اور ”وقائع راجستھان“ شامل ہیں۔ وہ ان کتب کی مدد سے لفظ ”سمرا“ کو واضح کرتے ہیں۔ وقائع راجستھان کے مطابق ”سمرا“ یہ ہیں:

''وقائع راجستھان میں ایک جگہ اومرا، سومرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اومرا کے صحیح معنی معلوم نہیں ہو سکے۔ سرائیکی اور سندھی زبانوں میں ''تھر'' کے رہنے والے کو تھوری کہتے ہیں۔ ''سُر'' لگانے والے کو سوری کہا جاتا ہے۔ دھبے دور کرنے والا دھوبی ہے۔ اسی اصول کے تحت امری کا باشندہ ''اومری'' کہلائے گا۔ سمراؤں نے اسی امری کے مقام پر جو سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر واقع ہے، کاشتکاری کو فروغ دیا تھا۔ جب یہاں سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ پہنچے تو امری کے حوالے سے انہیں ''اومری سمرا'' اور پھر ''اومرا سمرا'' کہا گیا۔ تورات میں ایک بادشاہ کا نام ''اومری'' بتایا گیا ہے۔'' (۱۰)

مہر صاحب نے اس طرح کے امتیازات کا قدم قدم پر مشاہدہ پیش کیا ہے۔ شاید انہی مشاہدات اور تجربات کا منطقی نتیجہ تھا کہ آپ ایک سرائیکی قوم کے سرپرست کے طور پر سامنے آئے اور اپنی قوم کی شناخت کی اساسی قدر ''زبان'' پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور بابائے سرائیکی کہلائے۔ وہ اس بیانیہ کو بھی سمجھ گئے تھے کہ بدیسی لوگوں کی لائی ہوئی تہذیب جو کہ مہاجرین کی وساطت سے اس دھرتی کا مقدر بنی تھی، اس نے یہاں کی تمام سماجی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو تہس نہس کر دیا اور آج پورا ملک شناختی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اسی باب میں طویل بحث کے بعد اپنا یہ تھیسز بیان کرتے ہیں:

''آج 1992ء میں جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، پاکستانی معاشرہ جس بحران میں مبتلا ہے، اس کی ذمہ داری صرف اور صرف اس وقت کے ایجوکیشنسٹس پر عائد ہوتی ہے جو قول اور عمل کے تضادات کا شکار ہو گئے، ذاتی مفادات کے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور ان مقاصد کو بھول گئے جن کی خاطر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ میری حیثیت ایک معمولی ٹیچر کی تھی، بس ذرا پرانا ٹیچر تھا، ذہانت، قابلیت، دیانتداری، اعلیٰ صلاحیت، علمی استعداد بلکہ سیرت و کردار کے جانچنے کا معیار گریڈ اور عہدہ تھا۔ چھوٹے آدمی کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ کوئی بڑی بات کرے یا بالاتر لوگوں پر تنقید کرے۔ اگر کسی چھوٹے ملازم سے کوئی کام کی بات حادث ہو جاتی تو اس کے بالا افسر کے کھاتے میں چلی جاتی کیونکہ یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ مذکورہ بالا صفات کی اجارہ داری صرف افسروں کے پاس ہے۔ چھوٹے ملازمین سے اسی طرح کام لے لیا جانا چاہیے جس طرح کاشتکار بیل یا ٹریکٹر سے کام لیتا ہے۔ انفرادیت اور استحصالی رویوں کے اس ماحول میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ قومی سطح پر سوچتا یا بے لوث خدمتِ وطن کی طرف قدم بڑھاتا۔ تارکینِ وطن کی لائی ہوئی تہذیب کا یہی تقاضا تھا۔'' (۱۱)

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان تارکین وطن نے ہمارے شہروں پر آ کر قبضہ کر لیا اور پھر تعلیم،

میڈیا اور تجارت ان کے گھر کی لونڈی ٹھہری۔ مذہب کی بنیاد پر یہاں کی شانت تہذیب میں توڑ پھوڑ کرنا ان کا وتیرہ بن گیا اور آج ستر برس بعد ہم اس مخمصے کا شکار ہیں کہ جائیں تو آخر جائیں کہاں؟

''نوکری کے آخری دس سال'' تیرھواں باب ہے۔ اس باب میں انھوں نے 1961ء سے 1971ء تک کی ملازمت کے احوال بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ہمارا سکول ڈیپارٹمنٹ کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہے اور انہوں نے کس طرح ذاتی کاوشوں سے اپنے سکول کی حالتِ زار کو سنوارا اور اسے ڈسٹرکٹ کا بہترین ادارہ بنادیا۔ اسی باب میں انھوں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور مظفر گڑھ سے ملتان ہجرت اور پھر یہیں مستقل سکونت کے احوال بھی بیان کیے ہیں اور ملتان میں آکر انھوں نے قرآن حکیم کا سرائیکی زبان میں ترجمہ، قصیدہ بردہ شریف کا ترجمہ اور ایجوکیشنل فلاسفی آف دی ہولی قرآن لکھی۔ اس باب کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''میری مالی حالت بے حد کمزور رہی۔ کبھی کوئی بینک بیلنس تھا ہی نہیں۔ ملتان میں ریڈیو پاکستان کا اجرا ہوا تو پروگرام ملنے لگے۔ ان کا معاوضہ بہت قلیل تھا تاہم سگرٹ کا خرچ نکلنے لگا۔ مہمان نوازی کا ذمہ بیگم نے اٹھا رکھا تھا۔ مکان کا کرایہ بھی وہی وصول کرتی تھیں اور مرمت وغیرہ اور دیکھ بھال کے اخراجات بھی اسی آمدنی میں پورے کرتی تھیں۔ ریڈیو سے تقریریں، فیچر، کہانیاں، بچوں کے پروگرام، نظمیں، مذاکرات وغیرہ ''جمہور کی آواز'' کے مستقل پروگرام کے لیے مقالات نشر کیے۔ پندرہ سال تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا اور دو ہزار سے زائد تحریریں اس ادارے کو دے دیں۔ پھر صحت کی خرابی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم پروڈیوسر صاحبان خاص مواقع پر اب بھی گھر پر آکر ریکارڈنگ کر جاتے ہیں۔ ٹیلی وژن سے بھی پانچ چھ پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے۔ 1974ء میں سرائیکی ادبی بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسے رجسٹرڈ کرا لیا۔ اس ادارے کو حکومت کی طرف سے گرانٹ ملنے لگی تو کتابوں کی اشاعت میں کچھ سہولت پیدا ہو گئی۔ 1975ء میں سرائیکی ادبی کانفرنس منعقد ہوئی۔ چند سیاسی لوگوں نے خالص ادبی مقاصد کو سبوتاژ کر دیا تاہم سرائیکی کی ترویج اور نشر و اشاعت کا کام جاری رہا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے ایم۔اے سرائیکی کے اجراء کا فیصلہ کیا تو اس کے سلیبس بنانے میں مدد دی۔ زکریا یونیورسٹی کے لیے بھی سلیبس بنایا لیکن یہاں ابھی تک کلاسیں جاری نہیں ہوئیں۔'' (۱۲)

آخری باب ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس باب میں انہوں نے 1949ء سے لے کر اپنی خود نوشت کی تکمیل تک 37 کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے علاوہ اپنے لکھے

ہوئے دیباچے، فلیپ اور تقریظوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ ان دیباچوں اور مقالات کی تفصیل بھی پیش کی ہے جو ان کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے ہیں۔

زیرِ نظر خود نوشت ''جو ہم پر گزری'' کا شمار اردو میں لکھی گئی کامیاب خود نوشتوں میں ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی سوانح عمری پتمبر سنگھ کی تحریر کردہ ''سیر الاسلام'' ہے جو 1820ء میں لکھی گئی۔(۱۳)

اس طرح شہر بانو کی خود نوشت ''بیتی کہانی'' 1885ء اور عبدالغفور نساخ کی خود نوشت 1886ء اور جعفر تھانیسری کی خود نوشت ''تواریخِ عجیب عرف کالا پانی'' 1890ء کی ہے۔(۱۴)

ان کے ساتھ ساتھ 1857ء کے بعد ظہیر دہلوی نے ''داستانِ غدر'' کے عنوان سے بھی ایک خود نوشت لکھی تھی۔ ان کے بعد بیسویں صدی میں تو خود نوشتوں کی ایک بہار آگئی اور حسرت موہانی، چودھری افضل حق، حکیم احمد شجاع، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مرزا فرحت اللہ بیگ، سید ہمایوں مرزا، عبدالمجید سالک، شاد عظیم آبادی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، مولانا حسین احمد مدنی، جوش ملیح آبادی، سر ظفر اللہ خان، احسان دانش، کلیم الدین احمد، مشتاق احمد خان، سبط حسن، شورش کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، میرزا ادیب، ضمیر جعفری، قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر وغیرہ نے کامیاب خود نوشتیں لکھیں۔ ان خود نوشتوں میں زیرِ نظر خود نوشت ''جو ہم پہ گزری'' اس لیے بھی لائقِ توجہ ہے کہ اس میں تقریباً پوری بیسویں صدی کے اہم سیاسی، سماجی اور ادبی حالات اور واقعات کو دلکش اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان، ادب، تہذیب اور ثقافت کا بیان بھی خوب ہے اور بین السطور سرائیکی وسیب کی محرومیوں اور دکھوں کی کسک بھی موجود ہے۔

یہ خود نوشت چودہ ابواب میں منقسم ہے جس کا آغاز مہر صاحب کے خاندانی پس منظر سے ہوتا ہے اور اختتام ان کی وفات سے چند برس پہلے کے حالات پر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ خود نوشت ایک شخص کی نہیں رہی بلکہ سرائیکی وسیب کی بیسویں صدی کی خود نوشت ہے کیونکہ اس میں ذاتی احوال و آثار کے بیان کے ساتھ سرائیکی وسیب کے متنوع لسانی، سیاسی، تعلیمی، معاشی اور تہذیبی خد و خال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)۔ لاہور، سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔ ص ۱۵
۲۔ ایضاً۔ ص ۱۵
۳۔ مولانا غلام رسول مہر، آپ بیتیوں کی اہمیت، مشمولہ مضمون نقوش (آپ بیتی نمبر)، لاہور، سن نامعلوم۔ ص ۳۸

۴۔ مشفق خواجہ، مختصر آپ بیتیاں، مشمولہ مضمون الزبیر، (آپ بیتی نمبر) سن نامعلوم۔ ص ۴۵

۵۔ الطاف فاطمہ، اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، ناشر اور سن نامعلوم، ص ۲۱

۶۔ صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، ادبی اصطلاحات کا تعارف، لاہور، اسلوب ۲۰۱۵ء۔ ص ۷

۷۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، کو مہر عبدالحق، ڈاکٹر، کا دیا گیا انٹرویو، مشمولہ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد۔ شمارہ ۲۳ بہار ۱۹۹۳ء اسلام آباد۔ اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۳ء ص ۲۱۳

۸۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر، ''جو ہم پہ گزری'' غیر مطبوعہ خودنوشت مملوکہ راقم (عکسی نقل، سن ندارد)۔ ص ۲

۹۔ ایضاً۔ ص؛ ۳

۱۰۔ ایضاً۔ ص؛ ۴

۱۱۔ ایضاً۔ ص؛ ۱۸۷

۱۲۔ ایضاً۔ ص؛ ۲۲۶

۱۳۔ معین الدین عقیل (مرتب)، بیتی کہانی، حیدر آباد دکن، ادارہ علمی، ۱۹۹۵ء ص ۸

۱۴۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۷ء ص ۵۹